

26-12-2016

کوئٹہ انکوائری کمیشن کی رپورٹ

مفتی منیب الرحمٰن

اس رپورٹ کے بعض پہلوؤں پر گزشتہ کالم میں گفتگو ہوچکی ہے، یہ رپورٹ انگریزی میں 86 صفحات پر مشتمل ہے، باقی کچھ ضمیمہ جات ہیں، اس لیے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ایک دو کالموں میں ممکن نہیں ہے۔ دراصل کمیشن نے اپنے آپ کو سانحہ کوئٹہ کی تحقیق تک محدود رکھنے کی بجائے دہشت گردی سے متعلق تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صوبۂ بلوچستان کا امن وامان تین اداروں کے سپرد ہے، ایک پولیس کا محکمہ جو انسپکٹر جنرل پولیس کے ماتحت ہے، لیکن اس کی عمل داری صرف بلوچستان کے دس فیصد رقبے تک محدود ہے جو اے زون کہلاتا ہے، دوسرا محکمہ لیویز کا ہے، یہ ڈی سی کے ماتحت ہے، یہ صوبے کا بی زون کہلاتا ہے، جو صوبے کے تقریباً 90 فیصد رقبے پر مشتمل ہے۔ تیسرا محکمہ فرنٹیئر کور ہے جو انسپکٹر جنرل ایف سی کے ماتحت ہے، آئی جی ایف سی میجر جنرل رینک کا آرمی آفیسر ہوتا ہے۔ اس کا اصل کام بغاوت پر آمادہ گروپوں، جن میں بلوچ لبریشن آرمی بھی شامل ہے، کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور بغاوت کی سرکوبی کرنا ہے، ایف سی لیویز کے ساتھ بھی تعاون کرتی ہے۔ الغرض امن وامان کی ذمے دار تینوں ایجنسیوں کی رپورٹنگ لائن الگ ہے، لہٰذا اس انتظامی مرکزیت کے فُقدان کا فائدہ قانون شکن عناصر کو ملتا ہے، کمیشن نے یہ بھی نوٹ کیا کہ بعض اوقات ایف سی یا لیویز پولیس کی مدد کو بروقت نہیں پہنچتیں۔ مزید یہ کہ بلوچستان کی مغربی سرحد کی مکمل نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے سرحد سے اندر آنے والے اور باہر جانے والے دہشت گردوں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا، کسٹم چیک پوسٹ سرحد سے فاصلے پر ہے، اس لیے اسمگلنگ پر بھی مکمل کنٹرول ممکن نہیں ہے۔

کمیشن نے قرار دیا کہ سانحے کے بارے میں صوبائی وزیرِ داخلہ، پولیس سربراہ اور وزیرِ اعلیٰ کے بیانات متضاد تھے۔ صوبائی وزیر داخلہ نے کہا کہ مجھے 99% یقین ہے کہ اس کے پیچھے ہندوستان کی ایجنسی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے پہلے دعویٰ کیا کہ ماسٹر مائنڈ پکڑا گیا ہے، پھر کہا: سہولت کار پکڑا گیا ہے، پولیس کے ڈی آئی جی نے دونوں دعووں کی تردید کی اور پھر وزیرِ اعلیٰ یا اس کے ترجمان نے کمیشن کے سامنے آکر اپنے موقف کا دفاع نہیں کیا، لہٰذا ڈی آئی جی پولیس کا موقف ہی حتمی قرار پایا۔ کمیشن نے میڈیا کے کردار کو بھی منفی قرار دیا اور بتایا کہ دہشت گرد پرنٹ والیکٹرانک میڈیا کو بڑی ہوشیاری سے اپنے مذموم مقاصد کی تشہیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چیف سیکرٹری بلوچستان نے بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان رابطے کے فُقدان کو تسلیم کرتے ہوئے کہا:

''ایف سی اپنے انسپکٹر جنرل کو رپورٹ کرتی ہے، بعض اوقات ایف سی، لیوی اور پولیس میں رابطہ جیسا کہ ہونا چاہیے، نہیں ہوتا۔

ایف سی کا مقامی کمانڈر ڈی سی آفس میں میٹنگ میں شریک نہیں ہوتا، حالانکہ اس مقصد کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کا سربراہ بلحاظ عہدہ ڈی سی ہوتا ہے۔ کمیشن نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ بلوچستان میں ایف سی کا کردار واضح نہیں ہے۔ چیف سیکرٹری اور اسکاؤٹس کے کمانڈر نے بتایا کہ ایف سی کے پاس پولیس کے اختیارات ہیں، جب کہ وفاقی وزارت داخلہ کے سیکرٹری نے کہا کہ ایف سی کو پولیس کے اختیارات نہیں دیے گئے''۔

کمیشن نے نیشنل ایکشن پلان کا بھی حوالہ دیا اور اس کے بیس نکات کو لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے، اس کی منظوری تمام جماعتوں نے دی تھی اور پھر اکیسویں آئینی ترمیم کے ذریعے اسے بعض نے خوش دلی سے اور بعض نے بادل ناخواستہ منظور کیا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا: ''اگرچہ یہ دستاویز ایک منصوبے کی صورت میں واضح اور دوٹوک ہے، لیکن ان بیس اہداف کے حصول کے لیے کوئی ''ٹائم لائن'' مقرر نہیں کی گئی۔ نیشنل ایکشن پلان میں یہ بھی طے نہیں کیا گیا کہ اس منصوبے کے مختلف اہداف ونکات کو نفاذ کے مرحلے تک پہنچانا کس کی ذمہ داری ہے۔ یہ امر بھی واضح نہیں ہے کہ اس پلان پر عملدرآمد کی نگرانی کون کرے گا اور اگر کسی کی طرف سے کوئی تقصیر ہوتی ہے، تو اس کی نشاندہی کون کرے گا اور پلان پر عمل درآمد میں اس کی تلافی کے لیے فالواپ ایکشن کون لے گا؟''۔

ان میں سے جو کام آسان تھا، اس پر جلد عمل درآمد شروع ہو گیا، یعنی خصوصی فوجی عدالتوں کا قیام، موت کی سزاؤں پر عمل درآمد اور نیکٹا کے ادارے کا قیام۔ پوری معنویت کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے، تو یہ ایکشن پلان کاغذ پر تو نہایت جامع اور مؤثر نظر آئے گا، لیکن اس کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر نتیجہ خیز بنانا اتنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً اس کی شق نمبر 17 میں ہے: ''صوبے میں سیاسی مفاہمت کے لیے صوبائی حکومت کو مکمل با اختیار بنانا'' اور اس عمل کو ریاست کے تمام عناصر یا ادارے جن کا مفاد وابستہ ہے، قبول کریں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کامیابی کی صورت میں اس کا کریڈٹ اور خدانخواستہ ناکامی کی صورت میں اس کی ذمے داری سب قبول کریں۔

جہاں پر داخلی امن وامان اور سلامتی کا جوابدہ ومختار ایک ادارہ نہ ہو، وہاں ذمے داری کس پر عائد ہوگی اور جوابدہی کس سے ہوگی، یہ ایک اہم سوال ہے، حالانکہ صوبۂ بلوچستان بین الاقوامی جاسوسی اداروں کی آماجگاہ بن چکا ہے اور را کے نشانے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی جگہ انٹیلی جنس ناکامی کو نہ زیر بحث لایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی سے مسئولیت ہوتی ہے، پس مؤثر نتائج کے لیے رپورٹنگ اور مسئولیت کی مرکزیت ضروری ہے۔

اسی طرح نیشنل ایکشن پلان کی ایک شق فاٹا سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: ''داخلی طور پر بے گھر افراد کی بحالی کے ساتھ انتظامی اور ترقیاتی اصلاحات کرنا''۔ فاٹا کی صورت حال تو بلوچستان سے بھی بدتر ہے اور دہشت گردوں کے خلاف ایک بڑے آپریشن کے سبب یہ واضح نہیں ہے کہ اختیارات کا ارتکاز کہاں ہے، فیصلہ سازی کا مرکز اور اس کے نفاذ کا بارگراں کس کے سر ہے، کیونکہ فوج یہاں مسئلے کی سب سے اہم فریق ہے۔ اسی طرح افغان مہاجرین کے بارے میں جامع پالیسی بنانا اور ان کی رجسٹریشن کا اہتمام کرنا بھی نیشنل ایکشن پلان کا حصہ تھا، مگر یہ مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے سے ان کو قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دیے جاتے رہے ہیں، افغان باشندوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکا، آسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ میں مستقل طور پر وطنیت اختیار کر چکی ہے، بعض سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات وغیرہ میں اپنے کاروبار قائم کر چکے ہیں۔ ایک بڑی تعداد پاکستان میں جائیدادیں لے کر مقامی معیشت کا حصہ

بن چکی ہے۔ ان کے حوالے سے جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، دفاع پاکستان محاذ، اے این پی، پختونخوا ملی عوامی پارٹی اور قومی وطن پارٹی کا موقف دوسری قومی سیاسی جماعتوں سے جدا ہے۔ ان کو جبراً افغانستان بھیجنا آسان بھی نہیں ہے اور اس سے فساد اور مناقشے کی ایک نئی صورت جنم لے سکتی ہے۔ ہماری بڑی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ دست بگریباں ہیں، ایسے میں کسی جامع اور قابلِ عمل قومی حکمت عملی کا بنایا جانا ناقابل تصور ہے۔ پورا سچ یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم ریاست وحکومت کو ایڈہاک ازم کی بنیاد پر چلا رہے ہیں۔ افغانستان کا مسئلہ ہمارے لیے نہایت پیچیدہ بن چکا ہے، گویم مشکل و نہ گویم مشکل کی سی صورت حال ہے۔ ہم دونوں پڑوسی ملک ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر پاتے اور اس کے نتیجے میں را اور بھارت کو افغانستان میں نفوذ ہی نہیں، بلکہ پالیسیوں پر مسلط ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایران کا مفاد بھی افغانستان سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ ہے۔

پس نیشنل ایکشن پلان اور نیکٹا کا منشور ایک نظریاتی شاہکار ضرور ہے۔ ہم ادارے قائم کرتے وقت ہر چیز کا احاطہ کرتے ہیں، ایک ہی ادارے کے ذریعے منصوبے کی حد تک تمام مسائل کا حل چاہتے ہیں، خواب دیکھنا اور بات ہے، عمل کی دنیا میں تمام مراحل سر کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ جناب جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اَہداف کا تعین تو کر دیا گیا ہے، لیکن ان کی جواب طلبی کس سے کی جائے گی، یہ مسئلہ واضح نہیں ہے۔

سابق وزیرِ اعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی نے کہا تھا: ''اب مخلوط حکومتیں ہی بنیں گی''۔ اس وقت صرف پنجاب اور سندھ میں ایک جماعت کی حکومت ہے، لیکن دونوں صوبوں میں الگ الگ پارٹیاں حکمران ہیں، وفاق، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں مخلوط حکومتیں ہیں۔ صوبہ سندھ اور خیبر پختونخوا کی حکومتیں وفاق کے ساتھ تصادم کی کیفیت میں ہیں۔ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزیرِ اعظم کے درمیان باہمی احترام اور اعتماد کا رشتہ ہونا چاہیے، لیکن جب صوبائی وزیرِ اعلیٰ وفاق کو للکار رہا ہو تو وفاق اور صوبے کے درمیان باہمی احترام پر مبنی تعلقات کار کیسے قائم ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاسی مناقشات اور تنازعات سیاسی جماعتوں کی قیادت نمٹائے اور وزرائے اعلیٰ وفاق کے ساتھ ایک سازگار اشتراکِ عمل کی فضا قائم کریں۔ برسرِ اقتدار جماعتیں اور حکومتیں الگ سہی، لیکن ملک ہم سب کا ہے، ریاست کا مفاد اور ملک وقوم کی سلامتی کے امور پر سب کا اتفاق لازمی ہے۔ ایک عرصے سے سی پیک پر اختلافات سامنے آ رہے ہیں، لیکن وزیرِ منصوبہ بندی جناب احسن اقبال کے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو سے اندازہ ہوا کہ اس میں وفاقی حکومت بھی بعض امور کی پابند ہے۔ مثلاً چین کی حکومت مختلف مراحل کے ٹھیکوں کے لیے تین کمپنیوں کو شارٹ لسٹ کرتی ہے، انہی کے درمیان ٹینڈر رہتا ہے اور بعض اوقات حکومت سب سے کم ریٹ دینے والی کمپنی سے مزید رعایت حاصل کرتی ہے۔ ان کمپنیوں کو پابند کیا جائے کہ پاکستانیوں کے لیے بھی روزگار کے مناسب مواقع نکالیں اور حتی الامکان مقامی میٹریل اور مشنری استعمال ہو۔ چین یقیناً چاہے گا کہ روٹ سستا ترین، مختصر ترین اور تیز ترین ہو، اسے یہ رقم آخر واپس بھی لینی ہے۔ ہم اپنی اپنی پسند و ناپسند، ترجیحات اور مفادات کی جنگ میں مصروف ہیں۔ کراچی میں جناب آصف علی زرداری کا استقبال ان کے قریبی افراد کے ہاں رینجرز کے چھاپے سے ہوا ہے، یہ محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس سے بدگمانی کے مواقع ضرور پیدا ہوتے ہیں۔

(روزنامہ دنیا، 26 دسمبر 2016ء)